# ایمان کیا ہے

مولانا بدر عالم میرٹھی

## کامل ایمان

شریعت میں ایمان و اسلام اتباع واطاعت کی اس آخری منزل کا نام ہے جس کے بعد اوامرِ الٰہیہ اور منہیاتِ شریعہ کے قبول کرنے سے قلب میں کوئی انحراف باقی نہ رہے۔ مخبرِ صادقؐ پر وہ اعتماد حاصل ہوجائے کہ پھر دل کی تمام خوشحالی اور روح کا کامل سرور اس کی تصدیق میں منحصر نظر آنے لگے۔ گویا جذبۂ وفاداری طلبِ دلائل کی مہلت نہ لینے دے۔ راہِ حق میں ہر نئی قربانی ایک نئی لذت ہو' اور ایک ادنیٰ نافرمانی وہ تلخ گھونٹ ہو جائے جو گلے سے اتارے نہ اترے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ (بقرہ ۲:۲'۳)

(یہ کتاب) راہ دکھانے والی ہے (اللہ) سے ڈرنے والوں کو' جو یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا۔

## ایمان بالغیب کی صفت

اس آیت میں ان ہی سرفروشوں کی اس سرمستی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ وہ جماعت ہے جو محض جذبۂ اتباع میں دیکھی اور ان دیکھی باتوں کی یکساں تصدیق کر چکی ہے۔ آنکھ اگر دیکھتی اور تصدیق کرتی ہے' کان اگر سنتے اور مان لیتے ہیں' تو یہ ان کا فطری اقتضاء ہونا چاہیے۔ لیکن آنکھیں اگر نہیں دیکھتیں' کان اگر نہیں سنتے' پھر' ان آنکھوں اور کانوں کے اعتماد پر جن کی صداقت پر سارا جہان قربان' اعتماد کر لیتے ہیں' تو پھر بلاشبہ یہ ان کے ایثار و تابع داری کی آخری دلیل ہو گی۔ یہی وثوق اور اعتماد ایمان کی روح ہے۔

## دلائل کی حقیقت

دلائل کی روشنی بھی کوئی روشنی ہے جو ایک قدم پر اگر چمکتی ہے تو دوسرے ہی قدم پر گل ہو جاتی ہے۔ اگر نبی صاحبِ وحی ہے' اور جو کہتا ہے وہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے کہتا ہے' تو

اس کے اعتماد پر اس کے تمام دین کو تسلیم کر لینا ایک اقتضاءِ طبعی ہونا چاہیے۔ کسی حقیقت کے مسلّم ہو جانے کے بعد بھی دلائل کی تلاش' روشن خیالی نہیں بلکہ ایک مختصر راہ کو اور طویل کر دینا ہے۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لانے کے بعد دعوتِ مناظرہ کے بجائے شروع سے عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر مدار صرف دلائل پر ہو' تو دلائل کبھی کبھی ہر دو طرف پیدا ہو جاتے ہیں ماسوا اس کے' مطالب کی نزاکت کبھی دلائل کی رسائی سے بالاتر ہوتی ہے۔ پھر مذاق کا تفاوت' سمجھ اور فہم کا اختلاف' اس پر وہمِ انسانی کی مزاحمت' یہ سب وہ موانع ہیں جو' نفسِ تصدیق کے لیے نہ سہی' مگر کم از کم عمل کے لیے تو یقیناً سدِّراہ بن جاتے ہیں۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے صرف اطاعت واتباع ہی کی ایک راہ بتلائی ہے'

مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر ۵۹:۷)

جو کچھ رسول تمہارے پاس لے کر آئے اس کو اختیار کر لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ۔

دلائل کا وسیع دائرہ بھی کچھ دور جا کر آخر اسی اتباع پر ختم ہو جاتا ہے۔ ورنہ ایک مقصد کے حصول کے لیے مقدمات کی بے شمار کڑیاں درکار ہوں گی۔ اگر سب کا طے کرنا ضروری ٹھہرے' تو پھر تمام عمر میں ایک مقصد کا حصول بھی خواب و خیال سمجھ لینا چاہیے۔ بہ نظرِ انصاف' ایک تجربہ کار محقق کا قول خود ایسی محکم دلیل ہوتی ہے جو تنہا ہزار دلائل کا وزن اپنے اندر رکھتی ہے۔ آج بھی ہم اپنے دلائل و براہین کا سلسلہ آخر میں یورپ کے فلاسفروں کی تھیوریوں پر جا کر ختم کر دیتے ہیں' اور صرف ان کے اسماء کا حوالہ دے دینا دلائل کی وہ معراج تصور کرتے ہیں جس کے بعد تمام دلائل سے بے نیازی ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ تھیوریاں بے دلیل مسلّم ہونے کے قابل ہیں' بلکہ اس کی تہہ میں یہ علمِ یقین پہلے حاصل ہوتا ہے کہ یہ تھیوریاں ان فلاسفروں کے نزدیک چونکہ اپنے دلائل سے ثابت شدہ ہیں' لہٰذا ان دلائل کا تلاش کرنا' اور پھر ان کا دوہرانا' محض ایک مسافت کا طویل کرنا ہو جاتا ہے۔

## علومِ نبوی کا مرتبہ

ٹھیک اسی پر علومِ انبیاء کو قیاس کر لینا چاہیے' اگرچہ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ ان کے علوم اپنی جگہ بھی ایسے دلائل سے ثابت شدہ ہوتے ہیں جہاں باطل کو کہیں سے راہ نہیں ملتی۔ لیکن وہ علمِ یقین کے اس مقام پر جا پہنچتے ہیں جس کے بعد ان کا لقب برہانِ مجسم ہو جاتا ہے'

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ○ (النساء ۴:۱۷۴)

اے لوگو ! پہنچ چکی ہے تمہارے پاس ایک سند تمہارے پروردگار کی طرف سے اور ہم نے تم پر واضح روشنی اتاری۔

## کمالِ تفویض و تسلیم

اس لیے انبیاء علیہم السلام کے علوم ان کے اعتماد پر تسلیم کر لینا کورانہ تقلید نہیں، بلکہ مجسم ایک برہان اور حجتِ بینہ کی تقلید ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایمان کی تمام قیمت بندہ کی صرف یہ ادا ہے کہ وہ رسولِ وقت کے سامنے اپنی ساری لن ترانیاں ختم کر دیتا ہے۔ درحقیقت یہ اس کی زبردست قربانی ہے، جسے وہ اپنے ضعیف و ناتواں ہاتھوں سے اپنے رب کی بارگاہ میں پیش کرتا ہے۔ انسان کی بے صبر فطرت اپنی جیسی مخلوق کو ایسے مقام پر کبھی دیکھنا پسند نہیں کرتی، جہاں بے دلیل سرنگوں ہو جانا تمام انسانوں کے لیے وقت کا سب سے بڑا فریضہ ہو جائے (یعنی رسول)۔ وہ خدائے تعالیٰ کی مخلوق ہے، اور اسی کی اطاعت اپنا فرض تصور کر سکتا ہے۔ اسی لیے مشرکینِ عرب میں بھی تمام جہالتوں کے باوجود ایک جماعت خدا پرست تھی، اور بزعمِ خود توحید کا انکار نہ کرتی تھی۔

اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ (الصّٰفّٰت ۳۷:۳۵)

جب کہا جائے ان سے کہ سوائے اللہ کے کوئی (اور) معبود نہیں تو غرور کرنے لگتے ہیں۔

یہاں لفظ **یجحدون** اسی لیے ارشاد نہیں فرمایا گیا کہ اس دعوت سے انہیں انکار نہ تھا۔ البتہ مسلمانوں کی آواز پر ان کا ہم آہنگ ہو جانا انکے نزدیک اپنی بڑائی کے خلاف تھا۔

## آدمؑ کو سجدہ کا حکم

عالم کا سب سے پہلا شقی، یعنی ابلیس، خالق السمٰوٰت والارضین کی عبادت سے کبھی منکر نہیں ہوا۔ لیکن مشیتِ ایزدی نے اس کے دعوائے تابعداری کا جب امتحان لیا تو اپنی عبادت کا امر فرما کر نہیں لیا، بلکہ ایک مشتِ خاک کے سامنے سر جھکانے کا امر فرمایا۔ ظاہر ہے کہ سر جھکا دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مگر ہاں دشواری تھی تو یہ تھی کہ ایک ضعیف ہستی کے سامنے سر جھکانا، جو مخلوق ہونے میں اس کی برابر کی شریک ہو، اس کی آواز فطرت کے برخلاف اور بظاہر ایک بے دلیل بات تھی۔ اس سے رہا نہ گیا اور

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (الاعراف ۷:۱۲)

میں بہتر ہوں اس سے۔ (کیونکہ) مجھ کو بنایا ہے تو نے آگ سے اور اس کو بنایا مٹی سے۔

کا نعرہ لگا بیٹھا۔ دلائل کی پیروی کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا وہ ہوا۔ اس کا پوشیدہ کبر اور طبعی انحراف پھوٹا' اور آخر وہ تسلیم و رضا کی اس منزل میں چل کر ناکام رہ گیا' جہاں خیر و شر کا سوال ہی باقی نہیں رہتا اور چون و چرا کا میدان تنگ ہو جاتا ہے ۔

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

(اصل چیز دوست کی خوشنودی ہے' ہجر و فراق کی کچھ اہمیت نہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہو گی' اگر دوست سے کسی اور کی خواہش کی جائے)۔

## طبعی انحراف وعلو کا خاصہ

طبیعت کے انحراف کا یہ خاصہ ہے کہ وہ تلاشِ حق کی تمام توفیق سلب کر دیتا ہے' اور وہ نشہ پیدا کر دیتا ہے جس کے بعد اپنی ہوائے نفس کے سامنے دلائل و براہین کی کچھ پار نہیں بستی۔ اطراف و جوانب سے آنکھیں بند ہوجاتی ہیں' اور اس بے شعوری کے عالم میں جو فیصلہ اپنے خیال میں آ جاتا ہے وہ آخری فیصلہ نظر آنے لگتا ہے۔ ابلیس نے صرف عنصرِ آتش کے شرف پر نظر کی۔ یہ اس کا قصورِ نظر تھا۔ عنصرِ خاک گو ضعیف ترین عنصر سہی مگر کیا ہو نہیں سکتا تھا کہ اس میں بھی کوئی جہت ایسی پیدا ہوجائے جو اسے قوی و برتر عنصر سے بھی افضل بنا دے۔ اگر ابلیس انسان کی صورت کی طرف بھی نظر کر لیتا تو اپنے مادہ کا شرف اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا۔ عنصرِ آتش ہزار اشرف سہی' مگر یہاں صورت صرف ایک حرف کُن نے عطا کی تھی۔ عنصرِ خاک پر جو نقش و نگار نظر آئے وہ نقاشِ ازل کے خود اپنے دستِ قدرت کا بلاواسطہ کمال تھا۔

**قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ۭ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ (ص ۳۸:۷۵)**

فرمایا' اے ابلیس تجھے کس چیز نے روکا کہ سجدہ کرتا اس کو جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا تھا۔ یہ تو نے غرور کیا یا تو درجہ میں بڑا تھا۔

نصبِ خلافت سے پہلے ہی یہ سبق تمام نسلِ انسانی کو دے دیا گیا تھا کہ اسے بھی اپنی اطاعت و انقیاد کا امتحان دینا ہو گا۔ کامیابی صرف اس صورت میں متصور ہو گی جب کہ' خدائے رب العزت کی رضا جوئی میں' اس کے رسولوں کے لیے بھی بے دلیل وہی جذبۂ اطاعت پیدا ہو جائے جو خود اس کے لیے موجزن ہو سکتا ہے۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی ہو گی کہ رسولوں کی باتوں

پر بے دلیل یقین کر لینا کیوں رکنِ ایمان قرار دیا گیا ہے۔

## کمالِ محبت، محبوب کی رضا میں فنا

حدیث شریف میں انصار کی محبت کو علاماتِ ایمان میں شمار کیا ہے۔ رسول اور اس کے کنبہ وقبیلہ یا ہم وطن کی محبت تو ہر مسلمان میں طبعی طور پر بھی ہو سکتی ہے، اور ہونی بھی چاہیے۔ مگر انصار کی محبت، جو نہ اس کا ہم قبیلہ تھے نہ ہم وطن، اگر ہو سکتی ہے تو صرف اس لیے کہ انھوں نے رسول کی ایسے آڑے وقت اعانت کی تھی جب کہ اس کے قبیلہ تک نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اور بلاشبہ یہ محبت کمالِ ایمان ہی کا ثمرہ ہو سکتی ہے۔ محبوب تو نظرِ عاشق میں سر تا سر محبوب ہوتا ہے۔ مگر اس میں کمال کیا ہے کہ اس کی ہر ہر ادا عشاق کی دلربائی کا مستقل ایک ایک افسوں ہوتا ہے، کمالِ محبت تو یہ ہے کہ اس کی رضا میں وہ فنا میسر ہو جائے کہ پھر یگانہ وبیگانہ، مکروہ و محبوب کا امتیاز جاتا رہے۔ بلکہ تمام محبت و شفقت، ہمدردی وسلوک، تعاون و سازگاری کا وہی ایک محور و مرکز بن جائے۔ مال و اولاد کا تو ذکر کیا ہے، اپنے نفس سے اگر محبت رہ جائے تو وہ بھی اسی کی خاطر ہو۔ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

اس کی راہ میں تمام قربانیاں شیریں بن جائیں۔ اس کے خلاف میں ساری خوشحالیاں کانٹے نظر آئیں۔ اس کے نام پر گردنیں اتروادینا حیوٰۃِ ابدی معلوم ہو۔ اپنی قربان گاہ سے ایک قدم پیچھے ہٹانا موتِ ابدی نظر آئے۔ اور یہ سب کچھ اس تصور میں ہو کہ یہ ساری جاں نثاریاں گو اس قابل نہ سہی کہ محبوب کے لیے قابلِ نظر ہوں، مگر ایک عاشق کی یہ حسرت ہونا چاہیے کہ راہِ عشق میں جو قربانی وہ کر سکتا ہے کر گزرے۔ حضرت بلالؓ و عمارؓ کے سرفروشانہ جذبات پر سیرت نگاروں کو حیرت ہے۔ مگر خود ان کی زبانی دریافت کیا جاتا تو ساقیٔ کوثر کے ہاتھ سے ان جام پینے والوں سے شاید انھیں شکایت ہوتی جنھیں اس کے ہاتھ سے جام پی کر تکلیف و راحت کا احساس باقی تھا۔

ازاں افیوں کہ ساقی کردہ بدمست
رفیقاں را نہ سر ماند نہ دستار

(ساقی نے جس چیز سے بدمست کر رکھا ہے، اس سے دوستوں کو کسی چیز کا ہوش نہیں ہے)۔

ایمان میں اسی منزل کا نام مقامِ یقین ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ عقلِ انسانی جب نشۂ یقین سے مخمور ہو جاتی ہے تو قلب و نفس بھی اس سے اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ پھر عالمِ غیب پر انکو محسوسات کی طرح یقین ہو جاتا ہے، فقر و غنا، حیوٰۃ و موت کے خرخشہ سے انسان بے

نیاز ہو جاتا ہے' اسباب کے قید و بند سے رستگاری میسر آ جاتی ہے۔

## مذہب کی روح اور بنیاد

یہ ہے وہ ایمان جس پر مذہب کی تمام بنیاد قائم ہے۔ کوئی عقیدہ اپنے دامن میں خواہ کتنی ہی نزاہت اور رفعتیں کیوں نہ رکھتا ہو' مگر اس نورِ ایمانی کے بغیر نظرِ شریعت میں وہ صرف ایک ظلمت کدہ اور سرتاسر تاریکی ہے۔ کوئی عمل' مجاہدات وریاضت کے خواہ کتنے ہی مراحل کیوں نہ طے کر چکا ہو' مگر بدون اس روحِ ایمانی کے ایک تنِ مردہ اور میزانِ آخرت میں قطعاً بے وزن ہے'

فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا (الکہف ۱۸:۱۰۵)

پس ہم ان کے لیے قیامت کے دن کوئی تول قائم نہ کریں گے۔

عقائد و اعمال کا تو ذکر کیا ہے' کوئی معمولی سی معمولی نیت بھی' خواہ کتنی ہی صاف و ستھری کیوں نہ ہو' اس سرمایۂ ایمان کے بغیر بارگاہِ بے نیاز میں کوئی اعتبار نہیں رکھتی۔ یہ ایمان' عقائد واعمال اور نیتوں کی وہ واحد روح ہے جس کے بعد کفر کی توبرتو تاریکیاں چشمِ زدن میں کافور ہو سکتی ہیں۔ آتش کدۂ جہنم اس کے روبرو سرد ہو سکتا ہے' اور گلزارِ عدن اس کا ایک طے شدہ معاوضہ بن جاتا ہے۔ ایک معمولی سجدہ طاعاتِ صد سالہ کے لیے مایۂ رشک اور مٹھی بھر جو کا صدقہ بے شمار تضاعیف (زیادتیں) کا مستحق نظر آنے لگتا ہے۔ غرض سعادتِ ابدیہ اسی مبداء کی خبر ہے' اور شقاوتِ ازلیہ اس سے محرومی کا نشان ہے۔ یہ سب کچھ اس سچی کتاب میں موعود ہے جو غلط گوئی سے بالکل منزہ اور مبالغہ آمیزی سے یکسر مبرّا ہے۔